ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2622

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: تاریخ افکار وعلوم اسلامی (2622)

طح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر 1 (پونٹ نمبر 1 تا 5)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 50

USMAN NOTES www.usmannotes.com

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعہ اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے اندازِ تحریر میں لکھیں، کیونکہ ہو بہو نقل کی گئی مشق یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس گائیڈ میں تاریخی و علمی معلومات عمومی مستند مآخذ کی روشنی میں اپنے الفاظ میں پیش کی گئی ہیں؛ جہاں اہلِ علم کی آراء میں اختلاف ہے وہاں اختلاف کا علمی ذکر کر دیا گیا ہے۔ کسی دینی حکم کا کسی مخصوص فرد یا واقعے پر اطلاق اہلِ علم اور باقاعدہ دائرہ اختیار کا کام ہے؛ یہ گائیڈ صرف تعلیمی و مطالعاتی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

طریقۂ استعمال: ہر جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جامع متن اور اختتام پر مشتمل ہے۔ جہاں سوال نے جدول یا خاکہ طلب کیا یا وضاحت کے لیے مناسب ہوا وہاں جدول اور شکل بھی دی گئی ہے۔ تاریخیں اور نام عمومی معلوماتی حوالے کے طور پر درج ہیں؛ تحریر کرتے وقت اپنے الفاظ استعمال کریں اور نصابی کتاب سے تصدیق ضرور کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

تاریخِ افکار و علومِ اسلامی (2622) ایم اے علومِ اسلامیہ کا وہ کورس ہے جو طالب علم کو مسلمانوں کی فکری و علمی تاریخ سے ترتیب وار روشناس کراتا ہے: علم کا اسلامی نظریہ، تفسیر، کلام، اصولِ فقہ اور فقہ کے مکاتب اس کے ابتدائی پانچ یونٹس کا موضوع ہیں۔ امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1 تا 5) میں پانچ سوالات دیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک 20 نمبر کا ہے؛ کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 50 ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر سوال کا جواب تعارف، ذیلی عنوانات اور اختتام کے ساتھ دیا گیا ہے اور جہاں وضاحت کے لیے مناسب ہو اجدول و شکل بھی شامل کی گئی ہے، تاکہ طالب علم مفاہیم سمجھ کر جواب اپنے الفاظ میں لکھ سکے۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال: مسلمانوں کے قدیم علمی نظریے کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں؟ نیز، تاریخِ علوم میں مسلمانوں کا کیا مقام اور کردار رہا ہے؟ ایک جامع نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

علم کے بارے میں مسلمانوں کا قدیم نظریہ کسی ایک کتاب یا ایک عالم کی ذاتی رائے کا نام نہیں تھا بلکہ قرآن و سنت سے ماخوذ ایک پورا فکری نظام تھا جس نے صدیوں تک مسلمان معاشرے کی تعلیم، تحقیق اور تہذیبی ترقی کی سمت متعین کی۔ اس نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ علم ایک مقدس امانت اور اللہ کی عطا ہے، اس کا حصول عبادت ہے، اس کا مقصد اللہ کی معرفت، انسان کی بھلائی اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اور اس کے استعمال پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسی نظریے کا عملی ثمرہ وہ عظیم علمی تحریک تھی جس نے بغداد، قرطبہ، قاہرہ، دمشق، سمرقند اور بخارا کو دنیا کے علمی مراکز بنا دیا اور جس کے ذریعے مسلمانوں نے طب، فلکیات، ریاضی، کیمیا، جغرافیہ، فلسفے اور تفسیر و حدیث و فقہ جیسے علوم میں بنیادی اضافے کیے۔ اس سوال کے جواب میں پہلے قدیم علمی نظریے کی نمایاں خصوصیات بیان کی جائیں گی، پھر تاریخِ علوم میں مسلمانوں کے مقام اور کردار کا جامع جائزہ پیش کیا جائے گا۔ تاریخِ علوم کا جدید مؤرخ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ یونانی و ہندی و فارسی علمی ورثہ مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ ہو کر، تنقیدی جائزے اور اضافوں کے ساتھ، یورپ تک پہنچا اور جدید سائنس کی تشکیل میں اس کا نمایاں حصہ رہا۔

قدیم علمی نظریے کی نمایاں خصوصیات

1۔ وحی کو علم کا اعلیٰ ترین ماخذ ماننا

مسلمانوں کے علمی نظریے کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے مآخذ میں وحی کو سب سے بلند مقام حاصل تھا۔ قرآن مجید کو ہدایت کا سرچشمہ اور علمِ یقینی کا معیار سمجھا جاتا تھا اور سنتِ نبوی کو اس کی عملی تفسیر قرار دیا جاتا تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ عقل و تجربے کو رد کر دیا جائے؛ بلکہ قرآن نے بار بار عقل کے استعمال، غور و فکر، مشاہدے اور تدبر کی دعوت دی۔ یوں وحی سمت دینے والی روشنی تھی اور عقل و حواس اسی روشنی میں کائنات اور معاشرے کا مطالعہ کرنے کے اوزار تھے۔ اس توازن نے مسلمان فکر کو نہ خالص نقل پرستی میں جکڑا اور نہ ہی بے لگام عقل پرستی میں مبتلا ہونے دیا، جس کا نتیجہ یہ علماء دینی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی و تجربی علوم بھی پروان چڑھے۔

2۔ علم کی دینی و دنیوی تقسیم سے گریز اور وحدتِ علم

دوسری نمایاں خصوصیت علم کی وحدت تھی۔ قدیم مسلمان اہلِ علم علم کو مقدس اور غیر مقدس خانوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے۔ جو علم انسان کے لیے نافع تھا، چاہے وہ قرآن کی تفسیر ہو یا انسانی جسم کا علاج، ستاروں کی گردش کا حساب ہو یا تجارت کا حساب کتاب، وہ سب دینی فریضے کی فضا میں حاصل کیا جاتا تھا۔ نیت اور مقصد کے اعتبار سے ہر نافع علم عبادت بن سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی عالم اکثر مفسر بھی ہوتا، محدث بھی، فقیہ بھی، اور ساتھ ہی ماہرِ فلکیات یا طبیب بھی۔ ابنِ سینا، خوارزمی، رازی اور بیرونی اسی وحدتِ علم کی زندہ مثالیں ہیں۔ بعد کے دور میں جب علم کی یہ وحدت کمزور ہوئی اور دینی و دنیوی تعلیم کے ادارے الگ الگ ہوتے گئے تو علمی زوال کی ایک بڑی وجہ بھی یہی قرار دی جاتی ہے، کیونکہ اس تقسیم نے نہ دین کو پوری زندگی سے جوڑے رکھا اور نہ دنیوی علوم کو اخلاقی سمت دی۔

3۔ علم کو فریضہ اور عبادت سمجھنا

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ حصولِ علم ذاتی شوق یا پیشہ ورانہ ضرورت نہیں بلکہ دینی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کی پہلی وحی کا آغاز ہی لفظ "اقرأ" یعنی "پڑھ" سے ہوا اور اسی سورت میں قلم کا ذکر آیا، جسے اہلِ علم نے تعلیم و تحریر کی اہمیت کی بنیادی دلیل قرار دیا ہے۔ علماء و طلبہ کا یہ عقیدہ تھا کہ علم سیکھنا اور سکھانا صدقۂ جاریہ ہے اور عالم کی فضیلت

محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے کیونکہ اس کے علم سے پورا معاشرہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی فکری بنیاد پر مساجد کے ساتھ مدارس قائم ہوئے، وقف کے ذریعے تعلیم مفت رکھی گئی، اساتذہ کو معاشرے میں بلند مقام ملا اور طلبہ دور دراز کے سفر کر کے علم حاصل کرنے کو اعزاز سمجھتے تھے۔ علم کو عبادت سمجھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ کتابت، خطاطی، کتب خانے اور ترجمے کی تحریکیں محض سرکاری سرپرستی سے نہیں بلکہ ذاتی جذبے سے چلتی رہیں۔

4۔ تنقیدی رویہ، تحقیق و سند کی پابندی

چوتھی خصوصیت تنقید و تحقیق کا مضبوط مزاج تھا۔ حدیث کے علم میں سند کی جانچ، راویوں کے حالات کی تحقیق اور جرح و تعدیل کا پورا نظام اسی مزاج کی سب سے منظم صورت ہے، جس میں کوئی خبر محض کہنے والے کے دعوے پر قبول نہیں کی جاتی تھی۔ اسی اصول کا اطلاق دوسرے علوم پر بھی ہوا: مسلمان ماہرینِ فلکیات نے بطلیموس کے ماڈل پر سوالات اٹھائے، طبیبوں نے جالینوس کی آراء کو تجربے پر پرکھا، اور بیرونی نے ہندوستان کے علوم و رسوم کا مطالعہ کرتے وقت غیر جانبدارانہ تحقیقی اصول خود تحریر کیے۔ تحقیق میں امانت داری کا تقاضا تھا کہ پیش روؤں کے اقوال ان کے نام کے ساتھ نقل کیے جائیں، اپنی رائے اور دوسروں کی رائے میں فرق رکھا جائے اور جس بات کا یقین نہ ہو اسے یقین کے لہجے میں بیان نہ کیا جائے۔ یہی تحقیقی دیانت آج کی علمی دنیا کے حوالہ جاتی نظام کی پیش رو سمجھی جا سکتی ہے۔

5۔ علم کا مقصد: معرفت، عمل اور انسانیت کی خدمت

پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ علم کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ معرفتِ حق، اصلاحِ عمل اور خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بے عمل علم کی مذمت کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ علم کی قدر اس کے ثمرات سے ہے۔ اسی مقصدیت نے مسلمانوں کو ان علوم کی طرف خاص توجہ دلائی جن کا براہِ راست فائدہ انسانیت کو پہنچتا تھا، مثلاً طب و جراحی، نہروں و زراعت کا علم، نقشہ سازی و جغرافیہ، اوقاتِ نماز و قبلے کے تعین کے لیے فلکیات و ریاضی، اور تجارت و وراثت کے حساب کے لیے الجبرا و حساب۔ علم کا یہ اخلاقی مقصد اسے خود غرضی اور تباہ کاری سے بھی بچاتا تھا؛ طبیب کے لیے اخلاقِ طب، قاضی کے لیے آدابِ قضا اور تاجر کے لیے دیانت کے اصول اسی فکری نظام کا حصہ تھے۔

جدول 1: قدیم مسلمان علمی نظریے کی خصوصیات اور ان کے عملی اثرات

عملی اثر	بنیادی تصور	خصوصیت
دینی علوم کی تدوین اور تمام علوم کو اخلاقی سمت	قرآن و سنت علم کا معیار و رہنما	وحی کی مرکزیت
ایک عالم کا بیک وقت کئی علوم کا ماہر ہونا	نافع علم کی دینی و دنیوی تقسیم نہیں	وحدتِ علم
مدارس، اوقاف، کتب خانے اور مفت تعلیم کا نظام	حصول و اشاعتِ علم عبادت	علم بطور فریضہ
علمِ حدیث میں جرح و تعدیل؛ تجربی علوم میں پرکھ	ہر دعوے پر تحقیق و حوالہ ضروری	تنقید و سند
طب، فلکیات، ریاضی و جغرافیہ میں عملی پیش رفت	علم کا ثمر مخلوق کی خدمت ہے	مقصدیت و عمل

تاریخِ علوم میں مسلمانوں کا مقام و کردار

تاریخِ علوم میں مسلمانوں کا کردار تین بڑی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی صورت حفظ و انتقال ہے: آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی کے دوران بغداد کے بیت الحکمہ اور دیگر مراکز میں یونانی، سریانی، فارسی اور ہندی کتابوں کے عربی تراجم ہوئے۔ ارسطو، افلاطون، بطلیموس، جالینوس اور اقلیدس کے علمی ورثے کا بڑا حصہ انہی تراجم کے ذریعے محفوظ ہوا؛ اگر یہ تراجم نہ ہوتے تو اس ورثے کا خاصا حصہ ضائع ہو چکا ہوتا۔ دوسری صورت تنقید و اضافہ ہے: مسلمان اہلِ علم محض ناقل نہیں تھے۔ خوارزمی نے الجبرا کو باقاعدہ علم کی صورت دی اور اس کے نام سے ”الگورتھم“ کی اصطلاح بنی؛ ابنِ الہیثم نے بصریات میں تجرباتی طریقہ اپنایا؛ رازی نے چیچک و خسرہ کی امتیازی تشخیص لکھی؛ ابنِ سینا کی ”القانون فی الطب“ صدیوں تک یورپ کی جامعات میں پڑھائی جاتی رہی؛ بیرونی نے زمین کے محیط کی پیمائش اور ہندوستان کے علوم پر بے مثال تحقیق پیش کی۔ تیسری صورت مغرب کو انتقال ہے: صقلیہ اور اندلس خصوصاً طلیطلہ کے تراجم کے ذریعے یہی عربی علمی سرمایہ لاطینی میں منتقل ہوا اور یورپ کی علمی بیداری کی بنیاد بنا۔ اس لیے مسلمانوں کا مقام محض ”درمیانی کڑی“ کا نہیں بلکہ باقاعدہ موجد، محقق اور استاد کا ہے، اگرچہ انصاف یہی ہے کہ ان کی بنیاد میں پیش رو تہذیبوں کا حصہ بھی تسلیم کیا جائے، جیسا کہ خود مسلمان علماء اپنے پیش روؤں کا نام لے کر کرتے تھے۔

مسلمانوں کے اس کردار کی ایک اور جہت ادارہ سازی تھی۔ رصد گاہیں، شفاخانے (بیمارستان)، مدارس اور عوامی کتب خانے باقاعدہ وقف نظام کے تحت چلتے تھے اور بعض جگہ طالب علموں کو وظائف بھی ملتے تھے۔ کاغذ سازی کی صنعت سمقند و بغداد سے پھیل کر اندلس اور پھر یورپ پہنچی، جس نے کتاب کو سستا اور عام کر دیا۔ ان اداروں نے علم کو فرد کی ذاتی کوشش سے نکال کر اجتماعی نظام بنا دیا، اور یہی ادارتی تسلسل کسی بھی تہذیب کی علمی عمر لمبی کرتا ہے۔ بعد کے ادوار میں سیاسی انتشار، منگول حملوں جیسی تباہ کاریوں اور اندرونی جمود کے باعث یہ تحریک سست پڑی، مگر اس کے اثرات یورپ کی نشاۃِ ثانیہ اور جدید سائنس میں جاری رہے۔ آج کے طالب علم کے لیے اس تاریخ کا سبق یہ ہے کہ علمی عروج کسی ایک نابغے سے نہیں بلکہ درست نظریے، اداروں، ترجیحات کی آزادی اور اخلاقی مقصد کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم علمی نظریے کی بنیاد وحی کی رہنمائی، علم کی وحدت، حصولِ علم کی فرضیت، تنقید و سند کی پابندی اور علم کی اخلاقی مقصدیت پر تھی۔ اسی نظریے نے تاریخِ علوم میں مسلمانوں کو محفوظ کرنے والے، اضافہ کرنے والے اور آگے پہنچانے والے کا بلند مقام دیا۔ یہ مقام فخر کے لیے بھی ہے اور ذمہ داری کے احساس کے لیے بھی، کیونکہ جس امت نے علم کو عبادت سمجھا تھا اس کے لیے علم سے دوری کسی بیرونی سازش سے زیادہ اپنے نظریے سے دوری کا نتیجہ قرار پائے گی۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال: تفسیر کا مفہوم واضح کریں، نیز فنِ تفسیر کے آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل پر ایک مفصل نوٹ قلمبند کریں۔ (20)

تعارف

قرآن مجید اسلام کا بنیادی ماخذ اور ہدایت کا سرچشمہ ہے، اور اس کے مفاہیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے علم کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ جب تک قرآن کا فہم محض تلاوت تک محدود رہے، اس کی ہدایت زندگی میں نافذ نہیں ہو سکتی؛ اسی لیے تفسیر کو اسلامی علوم کی بنیاد اور سب سے پہلا باقاعدہ طور پر پروان چڑھنے والا علم سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ نبوی سے لے کر

آج تک ہر نسل نے اپنی علمی ضرورتوں کے مطابق قرآن کی شرح و وضاحت کی ہے اور تفسیری ادب دنیا کی بڑی زبانوں میں ایک عظیم ذخیرہ بن چکا ہے۔ اس جواب میں پہلے تفسیر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم واضح کیا جائے گا، پھر اس سوال کا جائزہ لیا جائے گا کہ فنِ تفسیر کا آغاز کیسے ہوا اور کن ارتقائی مراحل سے گزر کر یہ ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر گیا۔

تفسیر کا مفہوم

لغوی مفہوم

"تفسیر" عربی کے مادے "ف س ر" سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں کھولنا، واضح کرنا، کسی پوشیدہ بات کو ظاہر کرنا اور کسی چیز کی حقیقت بیان کرنا۔ بعض اہلِ لغت نے اسے "سفر" سے بھی جوڑا ہے جس میں بھی ظاہر ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسے عورت کا چہرہ کھولنا۔ اس لغوی پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تفسیر کا کام چھپی ہوئی مراد کو کھول کر سامنے لانا ہے۔ لغوی مفہوم میں مفسر کی ذمہ داری کا ایک اشارہ بھی موجود ہے: وہ اپنی طرف سے معنی گھڑتا نہیں بلکہ متن میں موجود مراد کو قواعد و شواہد کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔ جہاں یہ حد پار ہو جائے اور ذاتی پسند کو قرآن کی مراد بنا کر پیش کیا جائے وہاں تفسیر نہیں بلکہ تحریف و تاویلِ باطل کا دروازہ کھلتا ہے، اسی لیے اہلِ علم نے تفسیر بالرائے کی بے احتیاط صورتوں پر سخت تنقید کی ہے۔

اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے الفاظ کے معانی، ان کے احکام، ان کی مراد اور ان کے نزول کے پس منظر کو انسانی استطاعت کے مطابق سمجھا جائے۔ مشہور تعریفات میں یہ عناصر شامل ہیں: الفاظ کی لغوی وضاحت، اعراب و قراءت کا بیان، اسبابِ نزول کی تحقیق، ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کی تعیین، اور آیات سے فقہی و اخلاقی احکام کا استنباط۔ اسی سے ملتا جلتا علم "تاویل" ہے۔ قدیم اہلِ علم کے ہاں تفسیر و تاویل اکثر ہم معنی استعمال ہوتے تھے، جبکہ بعد کے علماء نے عموماً یہ

فرق کیا کہ تفسیر کا تعلق الفاظ کے ظاہری و منقول معنی سے ہے اور تاویل کا تعلق محتمل معانی میں سے دلیل کی بنیاد پر ایک کو ترجیح دینے سے۔ طالب علم کے لیے یہ فرق اس لیے اہم ہے کہ وہ منقول تفسیر اور مفسر کے اجتہادی تبصرے کو ایک درجے میں نہ رکھے۔

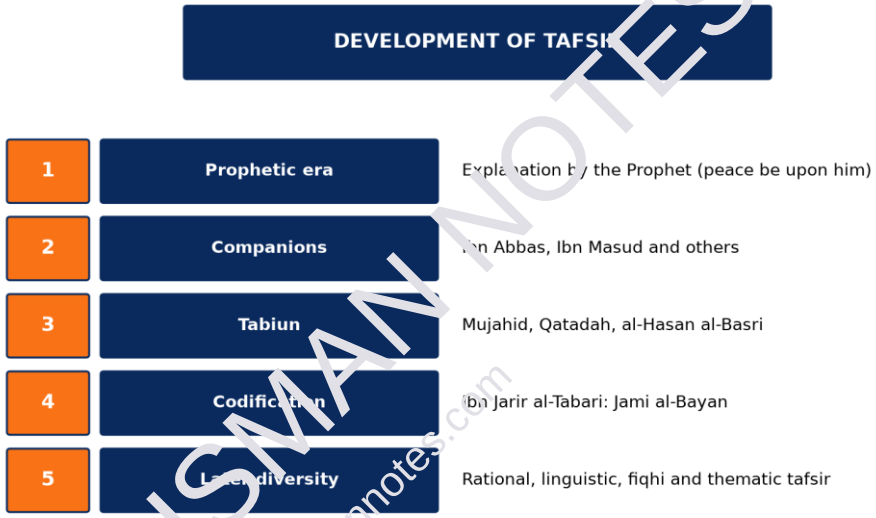


Figure 1: Main stages in the development of the science of Tafsir

شکل 1: فنِ تفسیر کے ارتقا کے بڑے مراحل — عہدِ نبوی سے تدوین و تنوع تک

فنِ تفسیر کا آغاز

فنِ تفسیر کا آغاز خود عہدِ نبوی سے ہوتا ہے۔ قرآن کا پہلا مفسر خود رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی؛ قرآن میں آپ ﷺ کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ لوگوں کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ اسے کھول کر بیان کر دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ صحابہ کے سوالات کے جواب میں آیات کی وضاحت فرماتے، اجمال کی تفصیل بیان کرتے اور عمل کر کے دکھا دیتے۔ نماز، زکاۃ، حج جیسے احکام کی عملی صورتیں اسی نبوی بیان سے سمجھ میں آئیں۔ اس دور میں تفسیر تحریر کی صورت میں نہیں تھی بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا علم تھا، اور اس کا معیار یہ تھا کہ صحابہ مشکل لفظ یا ابہام کی جگہ براہِ راست آپ ﷺ سے رجوع کرتے۔ صحابہ کے دور میں یہ سلسلہ آگے بڑھا؛ ایک طرف وہ صحابہ تھے جو اپنے عربی ذوق اور واقعات کی براہِ راست گواہی کی بنا پر وضاحت کرتے، اور دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسی شخصیات تھیں جن کے لیے آپ ﷺ نے حکمت و

تاویل کی دعا فرمائی تھی اور جنہیں "ترجمان القرآن" کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب اور دیگر جلیل القدر صحابہ سے بھی تفسیری اقوال بکثرت منقول ہیں۔

ارتقائی مراحل

پہلا مرحلہ: صحابہ و تابعین کا دور اور روایتی تفسیر

پہلے مرحلے میں تفسیر زیادہ تر روایت پر مبنی تھی۔ آیت کی تفسیر میں پہلے قرآن ہی کی دوسری آیات سے مدد لی جاتی، پھر نبوی بیان دیکھا جاتا، پھر صحابہ و تابعین کے اقوال نقل ہوتے۔ مکہ میں حضرت ابن عباس کی درس گاہ، مدینہ میں حضرت ابی بن کعب کی روایت اور کوفہ میں حضرت ابن مسعود کی تعلیم اس دور کے نمایاں مراکز تھے۔ تابعین میں مجاہد بن جبر، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر اور عکرمہ جیسے مفسرین کے اقوال بعد کی تمام تفاسیر کی بنیاد بنے۔ اس دور کی تفسیر کی خصوصیات اختصار، اسرائیلیات سے نسبتاً احتیاط اور لغت و اسبابِ نزول پر توجہ تھیں، اگرچہ بعد میں آنے والی بعض روایات میں اسرائیلی مواد بھی شامل ہوتا گیا جس کی جانچ کا کام محدثین و مفسرین نے اصولوں کی روشنی میں کیا۔

دوسرا مرحلہ: تدوین کا دور اور جامع تفاسیر

دوسرا مرحلہ دوسری و تیسری صدی ہجری میں تدوین کا ہے۔ پہلے تفسیر حدیث کے ابواب کے اندر بیان ہوتی تھی، پھر یہ مستقل کتابوں کی صورت اختیار کر گئی۔ مقاتل بن سلیمان اور دیگر ابتدائی مصنفین کے بعد اس مرحلے کا سب سے بڑا کارنامہ امام ابن جریر طبری کی "جامع البیان" ہے جس میں قرائن و اسانید کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال جمع کر دیے گئے اور ساتھ ہی لغوی و نحوی بحث بھی آ گئی۔ طبری کی تفسیر کو بعد کی تقریباً تمام تفسیروں کا ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں فقہی تفسیر کا رجحان الگ شکل میں سامنے آیا؛ امام جصاص کی "احکام القرآن" فقہی استنباط کی نمایاں مثال ہے۔ "تفسیر بالماثور" کی یہ روایت بعد میں ابن کثیر کی تفسیر میں اپنے کمال کو پہنچی، جس میں اخبار و آثار کی تنقیدی چھان بین نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔

تیسرا مرحلہ: عقلی، لغوی و ادبی تفسیر کا عروج

تیسرا مرحلہ عقلی و لغوی تنوع کا ہے۔ جب معتزلہ، اشاعرہ اور دیگر فکری مکاتب کے درمیان کلامی مباحث عام ہوئے تو تفسیر میں بھی عقیدے کی بحثیں داخل ہوئیں۔ زمخشری کی "الکشاف" بلاغت و لغت کی شاہکار سمجھی جاتی ہے، اگرچہ اس کے بعض اعتزالی خیالات پر اہلِ سنت کے علماء نے تنقید کی اور طالب علم کو یہ تنقیدی توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ فخر الدین رازی کی "مفاتیح الغیب" نے فلسفیانہ و سائنسی مباحث کو تفسیر میں وسیع جگہ دی۔ اس مرحلے کی خوبی یہ تھی کہ قرآن کو ہر دور کے علمی سوالات کے سامنے پیش کیا گیا؛ کمزوری یہ ہو سکتی تھی کہ مفسر کا اپنا مکتبی رجحان متن پر غالب آ جائے، اسی لیے جمہور علماء نے اصول مقرر کیے کہ عقلی تفسیر بھی لغت، سیاق اور منقول شواہد کی پابند رہے گی۔ قرطبی کی تفسیر فقہی مسائل پر، بیضاوی کی تفسیر اختصار و بلاغت کے امتزاج پر، اور آلوسی کی "روح المعانی" جامعیت پر مشہور ہوئی۔

چوتھا مرحلہ: جدید دور — موضوعاتی، سماجی و سائنسی رجحانات

چوتھا مرحلہ جدید دور کا ہے۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی فارسی تفسیر سے لے کر اردو تراجم و تفاسیر تک، اور عرب دنیا میں المنار، فی ظلال القرآن اور صفوۃ التفاسیر جیسے کاموں تک، تفسیر اپنی قوم کی زبان و مسائل سے جڑتی چلی گئی۔ جدید دور کے تین رجحانات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: موضوعاتی تفسیر جس میں ایک موضوع کی تمام آیات جمع کر کے مربوط مطالعہ کیا جاتا ہے؛ سماجی و اصلاحی تفسیر جو آیات کو معاشرے کی اصلاح سے جوڑتی ہے؛ اور سائنسی اشارات پر بحث، جس میں احتیاط لازم ہے کیونکہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں اور قرآن کو ہر بدلتے نظریے کا تابع بنانا درست روش نہیں۔ اردو زبان میں تفاسیر و تراجم کا بڑا ذخیرہ اسی دور کی دین ہے جس نے عام قاری کو براہِ راست قرآن کے فہم سے جوڑا۔ جدید محققین کے نزدیک دورِ حاضر کی بہترین تفسیر وہی ہے جو منقول ماخذ، لغت و بلاغت، تاریخی پس منظر اور عصرِ حاضر کے سوالات، چاروں کو اصولوں کے دائرے میں جمع کرے۔

جدول 1: فنِ تفسیر کے مراحل — دور، نمایاں مفسرین اور خصوصیات

مرحلہ	نمایاں نام / کتاب	بنیادی خصوصیت

نبوی بیان، مشاہدہ و لغوی ذوق	رسول اللہ ﷺ؛ ابن عباس، ابن مسعود	عہدِ نبوی و صحابہ
اقوال کی روایت، اسبابِ نزول	مجاہد، قتادہ، حسن بصری	تابعین و روایت
جامعیت، سند، فقہی سبق	طبری: جامع البیان؛ جصاص: احکام القرآن	تدوین
بلاغت، کلام و فلسفی مباحث	زمخشری، رازی، بیضاوی، آلوسی	عقلی و لغوی
موضوعاتی، سماجی و اصلاحی رجحان	المنار، فی ظلال القرآن، اردو تفاسیر	جدید دور

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر کے معنی قرآن کی مرادِ الٰہی کو کھول کر بیان کرنا ہیں اور یہ فن کسی کتابی صنعت کے طور پر بعد میں نہیں گھڑا گیا بلکہ اس کا آغاز خود نبی کریم ﷺ کے بیان سے ہوا۔ صحابہ و تابعین کی روایت، طبری کی تدوین، لغوی و عقلی مکاتب کی وسعت اور جدید دور کے موضوعاتی و سماجی رجحانات اس کے ارتقائی مراحل ہیں۔ ہر مرحلے نے قرآن کے فہم میں اضافہ کیا، اور ساتھ ہی یہ اصول بھی پختہ ہوتا گیا کہ تفسیر میں آزادی رائے کو نہیں بلکہ دلیل، لغت، سیاق اور منقول ماخذ کو حاصل ہے۔ یہی اصول آج کے طالب علم کو بھی ہر تفسیر پڑھتے وقت پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

سوال: علم کلام کے اہم مسالک کون کون سے ہیں؟ ان مسالک پر ایک مفصل نوٹ لکھیں، نیز متکلمین کی نمایاں تالیفات کا مختصر تعارف پیش کریں۔ (20)

تعارف

علمِ کلام اسلامی فکر کے ان علوم میں سے ہے جو عقائد کے اثبات، ان کی عقلی توضیح اور مخالف آراء کے جواب کے لیے وجود میں آیا۔ جب مسلمانوں کا واسطہ یونانی فلسفے، فارسی و ہندی افکار اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں سے بڑھا اور سوالات ان معاشرے کے اندر ایمان، قدر، صفاتِ الٰہی اور خلقِ قرآن جیسے مسائل پر بحثیں شروع ہوئیں تو عقائد کے دفاع کے لیے ایک باقاعدہ منہج کی ضرورت محسوس ہوئی؛ یہی منہج علمِ کلام کہلایا۔ اس علم کی تاریخ مختلف مسالک یعنی فکری مکاتب کی تاریخ بھی ہے، کیونکہ ہر مسلک نے چند بنیادی اصول اپنا کر باقی مسائل کو انہی سے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس جواب میں ہم اسلامی مسالک — خوارج و مرجئہ جیسے ابتدائی رجحانات سے لے کر معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور اہلِ حدیث کے منہج تک — کا تعارف پیش کیا جائے گا اور نمایاں متکلمین کی تالیفات کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بیان خالصتاً علمی و تاریخی ہے؛ عقائد کے معاملات میں قطعی فیصلے اور ان کا اطلاق اہلِ علم کا دائرہ ہے، یہاں مقصد مسالک کے افکار کو ان کے اپنے اصولوں کے ساتھ سمجھنا ہے۔

علمِ کلام کی تعریف اور پس منظر

اہلِ علم نے علمِ کلام کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں عقلی و نقلی دلائل سے دینی عقائد کا اثبات کیا جاتا ہے اور ان پر اٹھائے گئے شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ ایجی کی مشہور تعریف کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اس علم سے انسان عقائدِ حقہ کے اثبات اور دوسروں کے اعتراضات دفع کرنے پر قدرت حاصل کرتا ہے۔ اس علم کو "کلام" کہنے کی وجوہ میں یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کے مباحث کا مشہور عنوان "کلام اللہ" یعنی قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ رہا، اور یہ بھی کہ یہ علم محض گفتگو و مناظرے سے تعلق رکھتا تھا۔ پس منظر کے طور پر یہ یاد رہے کہ پہلی صدی ہجری میں مرتکبِ کبیرہ کے حکم، ایمان کی تعریف اور تقدیر کے مسائل پر خوارج، مرجئہ، قدریہ و جبریہ کے فکری رجحان ابھرے۔ دوسری صدی میں واصل بن عطا اور عمرو بن عبید سے معتزلہ کا باقاعدہ مکتب بنا، اور چوتھی صدی میں اس کے ردِ عمل و توازن کے طور پر ابو الحسن اشعری اور ابو منصور ماتریدی کے مکاتب سامنے آئے جو بعد میں اہلِ سنت کے غالب کلامی مکاتب قرار پائے۔

اہم کلامی مسالک

1۔خوارج ومرجئہ: ابتدائی فکری رجحانات

خوارج کا ظہور جنگِ صفین کے بعد تحکیم کے واقعے سے ہوا۔ ان کا بنیادی نعرہ یہ تھا کہ حکم صرف اللہ کا ہے، اور وہ مرتکبِ کبیرہ کو کافر قرار دے کر اس کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرتے تھے۔ علمِ کلام کی تاریخ میں ان کی اہمیت یہ ہے کہ ایمان و کفر اور گناہِ کبیرہ کے مسائل سب سے پہلے انہی کے ردِ عمل میں علمی بحث بنے، اگرچہ جمہور علماء نے ان کے تشدد آمیز نتائج کو قبول نہیں کیا۔ اس کے برعکس مرجئہ نے عمل کو ایمان کی تعریف سے خارج کر کے فیصلے کو اللہ پر چھوڑنے یعنی ارجاء کا نظریہ پیش کیا۔ ان کے نزدیک ایمان تصدیق کا نام ہے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب مؤمن ہی رہتا ہے، اس کا انجام اللہ کے سپرد ہے۔ ان دو انتہائی رویوں کے درمیان جمہور اہلِ سنت کا موقف اعتدال کا رہا جو ایمان میں تصدیق کے ساتھ اقرار اور عمل کو بھی اہمیت دیتا ہے، اگرچہ اس کی تفصیلات میں اہلِ علم کے درمیان علمی اختلاف موجود ہے جس کا ذکر نصابی کتاب میں تفصیل سے ملتا ہے۔

2۔معتزلہ

معتزلہ کلامی تاریخ کا سب سے منظم عقلی مکتب ہے۔ ان کے پانچ اصول مشہور ہیں: توحید، عدل، وعد و وعید، منزلۃ بین المنزلتین (مرتکبِ کبیرہ نہ مؤمن نہ کافر بلکہ درمیانی درجہ "فاسق")، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ توحید کی بحث میں انہوں نے صفات کو ذات سے الگ قدیم ماننے سے انکار کیا اور قرآن کو مخلوق کہا، جس مسئلے پر عباسی دور میں مشہور محنت کا واقعہ پیش آیا۔ عدل کے اصول میں انہوں نے انسان کو اپنے افعال کا خالق قرار دیا اور حسن و قبح کو عقلی کہا، یعنی عقل بعض چیزوں کے اچھے برے ہونے کو وحی سے پہلے بھی جان سکتی ہے۔ ابو الہذیل علاف، نظام، جاحظ اور قاضی عبد الجبار اس مکتب کے نمایاں نام ہیں۔ معتزلہ کی خدمات میں عقلی مناظرے کی روایت، فلسفے کے مباحث کو اسلامی فکر میں داخل کرنا اور مخالفین کے اعتراضات کے مدلل جوابات شامل ہیں؛ ان کے بعض نظریات پر اشاعرہ و ماتریدیہ نے تفصیلی تنقید کی جو آج تک کلامی ادب کا حصہ ہے۔

3۔اشاعرہ

اشعری مکتب کے بانی ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (متوفی324ھ تقریباً) پہلے معتزلی تھے، پھر انہوں نے اعتزال ترک کر کے ایک درمیانی منہج اختیار کیا جو نقل کے ساتھ عقل کو بھی دلیل کے طور پر استعمال کرتا تھا مگر عقل کو وحی کے تابع رکھتا تھا۔ اس مکتب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں: صفاتِ الٰہی کا اثبات بلا کیف و بلا تشبیہ، قرآن کو کلامِ الٰہی اور غیر مخلوق ماننا، انسانی افعال میں "کسب" کا نظریہ یعنی فعل کی تخلیق اللہ کی طرف سے اور کسب بندے کی طرف سے، اور حسن و قبح میں شرعی حیثیت کو بنیاد بنانا۔ ابو بکر باقلانی، ابن فورک، اسفرائینی، امام الحرمین جوینی اور غزالی نے اس مکتب کو منظم صورت دی۔ غزالی کی "الاقتصاد فی الاعتقاد" اور "تہافت الفلاسفہ" نے اشعری کلام کو فلسفے کے مقابلے میں مضبوط علمی بنیاد دی۔ اشعری مکتب بعد میں مالکی و شافعی حلقوں میں خاص طور پر پھیلا اور مدارس کے نصاب کا حصہ بنا۔

4۔ماتریدیہ

ماتریدی مکتب کے بانی ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی (متوفی333ھ تقریباً) سمرقند سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا مکتب حنفی فقہی حلقوں میں خاص طور پر مقبول ہوا۔ اشاعرہ سے کئی مسائل میں مطابقت کے باوجود ماتریدیہ کی بعض امتیازی خصوصیات یہ ہیں: عقل کو معرفتِ الٰہی اور بعض حسن و قبح کے ادراک میں نسبتاً زیادہ وزن دینا، ایمان کی تعریف میں تصدیقِ قلبی کو اصل قرار دینا، تکوینی صفات میں "تکوین" کو الگ صفت ماننا، اور اللہ کی حکمت و تعلیل پر زیادہ زور دینا۔ ابو الیسر بزدوی، ابو المعین نسفی اور بعد میں سعد الدین تفتازانی وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ نسفی کی عقائد پر متن "العقائد النسفیہ" اور اس پر تفتازانی کی شرح صدیوں سے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ ماوراء النہر، عثمانی ترکی اور برصغیر کے حنفی حلقوں میں ماتریدی کلام ہی کو عمومی سند حاصل رہی۔

5۔اہلِ حدیث کا منہج

کلامی مباحث کے متوازی اہلِ حدیث کا منہج یہ رہا کہ عقائد میں قرآن و صحیح سنت کے ظاہری و منقول مفہوم پر اکتفا کیا جائے، صفات کو بلا تاویل و بلا تشبیہ مانا جائے اور کلامی تاویلات و فلسفیانہ اصطلاحات سے اجتناب کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل کی استقامت، ابن تیمیہ کی "درء تعارض العقل والنقل" جیسی تصانیف اور ابن قیم کی تحریریں اس منہج کی

نمایاں نمائندگی کرتی ہیں۔ ابن تیمیہ نے عقل و نقل کے تعارض کے دعوے کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ موقف پیش کیا کہ صحیح عقل اور صریح نقل میں حقیقی تعارض ممکن نہیں۔ اس منہج کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس نے کلامی مکاتب کو ہمیشہ ماخذ کی طرف رجوع کی یاد دہانی کرائی اور عقائد کے بیان میں سلف کے اسلوب کو محفوظ رکھا۔ طالب علم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ تمام مکاتب اپنے اپنے دور کے سوالات کے جواب تھے اور ان کی بحثیں پڑھتے وقت تاریخی سیاق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

جدول 1: اہم کلامی مسالک — بانی / دور اور امتیازی اصول

مسلک	نمایاں نام	امتیازی اصول
خوارج	تحکیم کے بعد ابھرنے والا گروہ	مرتکبِ کبیرہ کی تکفیر، سخت موقف
مرجئہ	ابتدائی عباسی دور کے رجحان ساز	عمل ایمان سے خارج، فیصلہ اللہ پر مؤخر
معتزلہ	واصل بن عطا، قاضی عبدالجبار	پانچ اصول؛ عقل کی تقدیم، خلقِ قرآن
اشاعرہ	ابوالحسن اشعری، غزالی	صفات بلا کیف، نظریہ کسب
ماتریدیہ	ابو منصور ماتریدی، نسفی	تصدیق اصلِ ایمان، صفتِ تکوین، حکمت
اہلِ حدیث	امام احمد، ابن تیمیہ	منقول پر اکتفا، تاویل سے اجتناب

متکلمین کی نمایاں تالیفات کا مختصر تعارف

کلامی ادب کی چند نمایاں کتابیں یہ ہیں۔ ابوالحسن اشعری کی "مقالات الاسلامیین" فرقوں و آراء کے تعارف کی بنیادی کتاب ہے اور ان کی "الابانہ" و "اللمع" ان کے منہج کی نمائندہ ہیں۔ قاضی عبدالجبار کی "شرح الاصول الخمسہ" اور "المغنی" اعتزالی کلام کے سب سے بڑے مآخذ ہیں۔ امام غزالی کی "الاقتصاد فی الاعتقاد" اشعری عقائد کی متوازن پیشکش ہے جبکہ "تہافت الفلاسفہ" فلاسفہ کے بیس مسائل پر تنقید کی وجہ سے مشہور ہوئی، اور اس کے جواب میں ابن رشد نے "تہافت التہافت" لکھی، جس سے کلام و فلسفے کا

یہ مکالمہ آج تک مطالعے کا موضوع ہے۔ شہرستانی کی "الملل والنحل" مذاہب و مکاتب کے تقابلی تعارف کی کلاسیکی کتاب ہے۔ عضد الدین ایجی کی "المواقف" اور اس پر جرجانی کی شرح، تفتازانی کی "شرح العقائد النسفیہ" اور "شرح المقاصد"، اور ماتریدی کی "کتاب التوحید" و "تاویلات اہل السنہ" اپنے اپنے مکاتب کے بنیادی متون ہیں۔ یہ کتابیں محض عقائد کی فہرستیں نہیں بلکہ منطق، فلسفہ اور زبان کے مباحث سے بھرپور ہیں، اس لیے انہیں پڑھنے کے لیے باقاعدہ استاد اور تیاری درکار ہوتی ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ علمِ کلام کے مسالک دراصل عقائد کی توضیح کے مختلف مناہج ہیں: خوارج و مرجئہ نے ابتدائی سوالات کھڑے کیے، معتزلہ نے عقل کو مرکز بنایا، اشاعرہ و ماتریدیہ نے نقل و عقل کے توازن سے اہلِ سنت کے عقائد کو منظم کیا، اور اہلِ حدیث نے منقول اسلوب کی حفاظت کی۔ ان مسالک کی تالیفات — مقالات الاسلامیین سے شرح العقائد تک — اسلامی فکر کی سب سے زیادہ زیرِ مطالعہ کتابوں میں شامل ہیں۔ ان مباحث کو تعصب کے بجائے علمی آلات سے پڑھنا ہی ان کا صحیح حق ہے، اور اختلافی مسائل میں حتمی حکم لگانا اس گائیڈ کا مقصد نہیں بلکہ اہلِ علم کا کام ہے۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

سوال: اصولِ فقہ کی تعریف بیان کریں۔ علم اصولِ فقہ کی اہمیت اور اس کی تدوین کے مراحل پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔ (20)

تعارف

فقہ اسلامی قانون و شریعت کا وہ علم ہے جو انسان کے روزمرہ اعمال کے احکام بیان کرتا ہے، مگر ہر حکم کسی دلیل سے نکالا جاتا ہے۔ جس علم میں ان دلائل کی اقسام، ان سے حکم نکالنے کے قواعد اور مجتہد کے لیے لازم اصول بیان ہوں اسے اصولِ فقہ کہتے ہیں۔ اسے فقہ کی بنیاد، اجتہاد کی کنجی اور اختلافِ فقہی کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر فقہ کو عمارت کہا جائے تو اصولِ فقہ اس کی بنیاد اور نقشہ ہے؛ بغیر اصول کے نہ پیش رو فقہاء کے استدلال سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ نئے مسائل کا شرعی حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس جواب میں اصولِ فقہ کی تعریف، اس کی اہمیت اور اس کی تدوین کے مراحل تفصیل سے بیان کیے جائیں گے، تاکہ طالب علم کو یہ بھی معلوم ہو کہ یہ علم اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ صدیوں کے علمی عمل کا نتیجہ ہے۔

اصولِ فقہ کی تعریف

لغوی طور پر "اصل" اس بنیاد کو کہتے ہیں جس پر کوئی چیز قائم ہو، اور "فقہ" کے معنی گہری سمجھ کے ہیں۔ اصطلاح میں اصولِ فقہ کی مشہور تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ ان قواعد و دلائل کا علم ہے جن کے ذریعے اجمالی دلائل سے فرعی شرعی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اس تعریف کے تین اجزا ہیں: پہلا، دلائلِ اجمالی یعنی کتاب، سنت، اجماع اور قیاس جیسے مجموعی مآخذ؛ دوسرا، استنباط کا طریقہ یعنی عام و خاص، مطلق و مقید، امر و نہی اور ناسخ و منسوخ جیسے قواعد؛ تیسرا، مجتہد کی اہلیت و شرائط۔ اصولِ فقہ کا موضوع یہی تینوں چیزیں ہیں، جبکہ فقہ کا موضوع مکلف کے افعال اور ان کے احکام ہیں۔ دونوں کا فرق یہ ہے کہ فقیہ تیار حکم بیان کرتا ہے جبکہ اصولی اس حکم تک پہنچنے کا راستہ اور اس کی دلیل کا درجہ بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ نماز واجب ہے، فقہ کا مسئلہ ہے؛ یہ بتانا کہ "اقیموا الصلاۃ" میں امر وجوب کے لیے آتا ہے، اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے۔

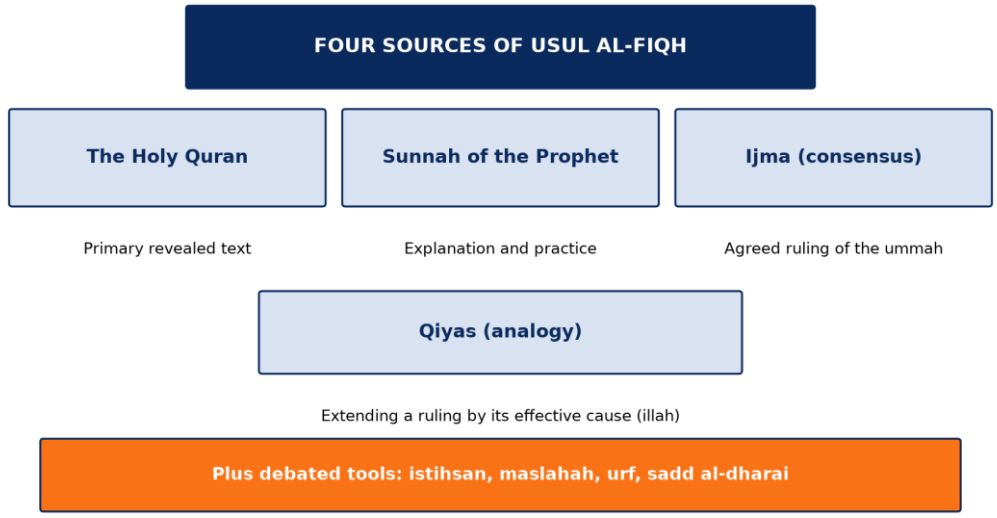


Figure 2: The agreed and debated sources used in Usul al-Fiqh

شکل 1: اصولِ فقہ کے متفقہ مآخذ اور زیرِ بحث اضافی اوزار

علم اصولِ فقہ کی اہمیت

اس علم کی اہمیت کئی جہتوں سے واضح ہوتی ہے۔ پہلی جہت اجتہاد کی اہلیت ہے: اصول کے بغیر کوئی شخص قرآن و سنت سے براہِ راست حکم نکالنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ نصوص میں عام بھی ہے اور خاص بھی، مطلق بھی ہے اور مقید بھی، اور بظاہر متعارض نصوص کا حل بھی اصول ہی سکھاتے ہیں۔ دوسری جہت اختلافِ فقہاء کی تفہیم ہے: جب طالب علم جانتا ہے کہ حنفی اصولیین کے ہاں قطعی و ظنی کی تقسیم اور شافعی اصولیین کے ہاں قیاس کی حدود اور مفہومِ مخالف کے حجت ہونے یا نہ ہونے میں فرق ہے تو ائمہ کے اختلاف کو وہ غلطی یا دشمنی نہیں بلکہ اصولوں کا قدرتی نتیجہ سمجھتا ہے، جس سے فرقہ وارانہ سختی کم ہوتی ہے۔ تیسری جہت تحفظِ شریعت ہے: اصول ہر دعوے کو دلیل کے پابند بناتے ہیں، جس سے خواہش پر مبنی تاویل کا راستہ بند ہوتا ہے۔ چوتھی جہت عصر حاضر کے نئے مسائل سے تعلق ہے: بینک کاری، طبّی مسائل، ٹیکنالوجی اور معاشرتی تبدیلیوں کے شرعی حل کے لیے قیاس، مصالح اور مقاصدِ شریعت جیسے اصولی اوزار ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے اصولِ فقہ کو ماضی کا علم سمجھنا غلط ہے؛ یہ ہر دور میں فقہ کو زندہ رکھنے کا نظام ہے۔

تدوین کے مراحل

پہلا مرحلہ: عہدِ نبوی و صحابہ میں عملی اصول

تدوین سے پہلے اصول عملاً موجود تھے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت فیصلے کی ترتیب پوچھی تو انہوں نے کتاب اللہ، پھر سنت، پھر اپنے اجتہاد کا ذکر کیا اور آپ ﷺ نے اس کی تحسین فرمائی؛ اس روایت کو اصولیین استنباط کی ترتیب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ صحابہ کرام مسائل میں قیاس، مصلحت اور مآخذ کی ترتیب کا عملی استعمال کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطوط و فیصلے، حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے استدلال اور صحابہ کے اجماعی فیصلے اصول کے عملی نمونے ہیں۔ اس دور میں اصول الگ کتابوں میں نہیں بلکہ فقہی عمل کے اندر موجود تھے۔ تابعین و تبع تابعین کے دور میں جب فقہی مکاتب بننے لگے تو ہر مکتب کے عملی منہج سے اس کے اصول واضح ہونے لگے؛ مالکی مدینہ کے عمل کو اہمیت دیتے اور حنفی قیاس و استحسان کو وسعت دیتے، جس سے بعد کی اصولی بحثوں کے بیج پڑ گئے۔

دوسرا مرحلہ: امام شافعی کی الرسالۃ اور بنیاد گذاری

اصولِ فقہ کی باقاعدہ تدوین کا سب سے بڑا سنگِ میل امام محمد بن ادریس شافعی (متوفی 204ھ) کی کتاب "الرسالۃ" ہے، جسے اس علم کی پہلی مفصل و مستقل کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں امام شافعی نے بیان کیا کہ کتاب و سنت میں سے کس دلیل کو کس پر مقدم رکھا جائے گا، ناسخ و منسوخ کیسے پہچانا جائے گا، عام و خاص کا تعلق کیا ہے، خبرِ واحد کی حیثیت کیا ہے، اجماع کسے کہتے ہیں اور قیاس کہاں جائز ہے اور کہاں نہیں۔ اس کتاب کی اہمیت صرف اس کے مندرجات میں نہیں بلکہ اس منہج میں ہے کہ فقہی اختلاف کو جذبات کے بجائے قواعد کی زبان دی گئی۔ امام شافعی کو اسی لیے اصطلاحاً اصولِ فقہ کا مؤسس کہا جاتا ہے، اگرچہ ان سے پہلے امام ابو حنیفہ کے شاگردوں خصوصاً امام ابو یوسف و امام محمد کی تحریروں میں بھی اصولی اشارات موجود تھے اور مالکی و حنفی حلقوں میں عملی اصول پہلے سے رائج تھے۔

تیسرا مرحلہ: دو منہج — متکلمین اور فقہاء (حنفیہ)

تیسری و پانچویں صدی میں تدوین دو متوازی منہجوں میں آگے بڑھی۔ ایک منہج متکلمین کا تھا، جس میں اصول کو کلامی و منطقی اندازمیں، مثالوں سے نسبتاً الگ رکھ کر تحریر کیا گیا؛ قاضی عبد الجبار، ابو الحسین بصری کی "المعتمد"، باقلانی، جوینی کی "البرہان" اور غزالی کی "المستصفی" اس روایت کی نمایاں کتابیں ہیں۔ غزالی نے المستصفی میں اصول کو چار اقطاب — احکام، دلائل، استنباط کے طریقے اور مجتہد — میں منظم کیا جو بعد کے مصنفین کے لیے نمونہ بنا۔ دوسرا منہج فقہاء خصوصاً حنفیہ کا تھا، جس میں اصول کو موجود فروعی مسائل سے اخذ کر کے تحریر کیا گیا؛ جصاص کی "الفصول"، دبوسی، سرخسی کی "اصول السرخسی" اور بزدوی کی اصول اس کی مثالیں ہیں۔ اس دور میں علم پختہ ہوا، اصطلاحات طے ہوئیں اور دلائل کی درجہ بندی — خصوصاً قطعی و ظنی — منظم ہوئی۔ آمدی کی "الاحکام"، ابن الحاجب کی مختصر اور بیضاوی کی "منہاج" نے اس علم کو تدریسی متون کی شکل دی۔

چوتھا مرحلہ: مقاصد، اختصار و شروح اور جدید دور

بعد کے ادوار میں دو رجحان نمایاں ہوئے: ایک طرف متون کی اختصار و شروح و حواشی کی روایت چلی جس نے تعلیم کو آسان کیا مگر بعض اوقات تحقیق کو مختصرات تک محدود بھی کر دیا؛ دوسری طرف عزالدین بن عبد السلام اور [illegible] شاطبی نے "الموافقات" میں مقاصدِ شریعت کو اصول کا مرکزی موضوع بنا کر اس علم کو نئی وسعت دی۔ شاطبی کا یہ کارنامہ آج کے دور میں خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ نئے مسائل میں صرف لفظی دلالت نہیں بلکہ شریعت کے مقاصد — دین، جان، عقل، نسل و مال کا تحفظ — بھی رہنما بنتے ہیں۔ جدید دور میں اصولِ فقہ پر اردو و انگریزی سمیت کئی زبانوں میں کتب لکھی گئیں، جامعات میں اس کا تقابلی مطالعہ ہونے لگا اور اسلامی بینک کاری و جدید قانون سازی کے تناظر میں اجماعِ عصر، اجتماعی اجتہاد اور فقہ اکیڈمیوں کے کردار پر بحث عام ہوئی۔ یوں یہ علم تدوین سے اختصار اور اختصار سے تجدید کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جدول: تدوینِ اصولِ فقہ کے مراحل اور نمایاں کتابیں

مرحلہ	نمایاں کتاب / شخصیت	کارنامہ
عملی دور	صحابہ و تابعین کے فیصلے	قیاس و اجماع کا عملی استعمال
بنیاد گذاری	شافعی: الرسالۃ (204ھ)	دلائل کی ترتیب و قواعد کی اولین تدوین
پختگی: متکلمین	غزالی: المستصفیٰ؛ آمدی: الاحکام	منطقی تنظیم، چار اقطاب کی تقسیم
پختگی: حنفیہ	سرخسی: اصول السرخسی؛ بزدوی	فروع سے اصول کا استخراج
مقاصد و جدید	شاطبی: الموافقات	مقاصدِ شریعت کو مرکزی مقام

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ اصولِ فقہ وہ قواعد ہیں جن سے اجمالی دلائل سے احکام نکالے جاتے ہیں؛ اس کی اہمیت اجتہاد کی اہلیت، فقہی اختلاف کی درست تفہیم، شریعت کے تحفظ اور نئے مسائل کے حل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی تدوین عہدِ نبوی ﷺ صحابہ کے عملی استدلال سے شروع ہو کر امام شافعی کی الرسالۃ پر باقاعدہ علم بنی، متکلمین و فقہاء کے دو منہجوں سے پختہ ہوئی اور شاطبی کے مقاصدی اضافے کے بعد جدید دور میں اجتماعی اجتہاد کی بحثوں تک پہنچی۔ جو طالب علم اس سفر کو سمجھ لے وہ فقہ کو جامد احکام کی فہرست کے بجائے ایک زندہ علمی نظام کے طور پر دیکھنے لگتا ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال: علم فقہ سے کیا مراد ہے؟ نیز مسالک اربعہ (چار فقہی مکاتب فکر) کی اہم بنیادی تالیفات کون کون سی ہیں؟ اس پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔ (20)

تعارف

علمِ فقہ اسلام کے عملی قانون کا علم ہے: عبادات کیسے ادا ہوں، معاملات کیسے درست ہوں، خاندانی و معاشرتی زندگی کے مسائل کا شرعی حکم کیا ہے، اور ریاست و فرد کے حقوق و فرائض کیسے متعین ہوتے ہیں — یہ سب فقہ بتاتی ہے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں فقہ ہی نے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو نظامی شکل دی اور اسی کے اندر چار بڑے فقہی مکاتب یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی پروان چڑھے جنہیں مسالکِ اربعہ کہا جاتا ہے اور جن کے پیروکار آج دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت ہیں۔ اس جواب میں پہلے علمِ فقہ کی تعریف و دائرہ بیان کیا جائے گا، پھر چاروں مکاتب کا مختصر تعارف اور ان کی اہم بنیادی تالیفات کا تعارف پیش کیا جائے گا۔ یہاں بھی واضح رہے کہ فقہی اختلاف امت میں علمی اختلاف ہے؛ کسی مخصوص مسئلے میں کسی فرد کے لیے حتمی رہنمائی مستند اہلِ علم سے حاصل کی جاتی ہے۔

علمِ فقہ سے مراد

فقہ کے لغوی معنی گہری سمجھ اور کسی چیز کی تہ تک پہنچنا ہیں۔ اصطلاح میں امام ابو حنیفہ سے منسوب مشہور تعریف یہ ہے کہ فقہ نفس کا اپنے حقوق و فرائض کو جاننا ہے، جبکہ فقہاء کی رائج تعریف یہ ہے کہ تفصیلی دلائل سے حاصل کیے گئے عملی شرعی احکام کا علم فقہ ہے۔ اس تعریف سے تین باتیں نکلتی ہیں: فقہ کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ عمل سے ہے؛ اس کے احکام دلائل یعنی قرآن، سنت، اجماع و قیاس سے لیے جاتے ہیں؛ اور یہ میں عبادات کے ساتھ معاملات، نکاح و طلاق، مالی قوانین، حدود و تعزیرات اور بین الاقوامی تعلقات تک کے ابواب شامل ہیں۔ فقہی احکام پانچ درجات میں بیان کیے جاتے ہیں: فرض یا واجب، سنت، مباح، مکروہ اور حرام۔ فقہ کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قدیم فقہی کتب "کتاب الطہارۃ" سے شروع ہو کر "کتاب الفرائض" یعنی وراثت پر ختم ہوتی ہیں اور زندگی کا کوئی بڑا میدان ان سے باہر نہیں رہتا۔

مسالکِ اربعہ کا مختصر تعارف

1۔ حنفی مکتب

حنفی مکتب کے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (80ھ تا 150ھ) کوفہ سے تعلق رکھتے تھے جو حدیث و فقہ کا بڑا مرکز تھا۔ اس مکتب کی خصوصیات میں قیاس کی منظم صورت، استحسان کا اصول، اہلِ رائے کی روایت اور فقہی مسائل کی فرضی صورتوں تک تحقیق شامل ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی نے اس مکتب کی تدوین میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ مکتب عباسی خلافت، عثمانی سلطنت اور برصغیر میں سرکاری و غالب مکتب رہا؛ آج ترکی، بلقان، وسط ایشیا، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے اکثر مسلمان اسی کے پیروکار ہیں۔

2۔ مالکی مکتب

مالکی مکتب کے امام مالک بن انس (93ھ تا 179ھ) مدینہ منورہ کے امام تھے اور ان کی کتاب "الموطا" حدیث و فقہ کی اولین عظیم تدوین سمجھی جاتی ہے۔ اس مکتب کی خاص بنیاد اہلِ مدینہ کے عمل کو حجت ماننا ہے، کیونکہ مدینہ نبوی دور کی عملی روایت کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ مصالحِ مرسلہ اور سدِ ذرائع جیسے اصولوں کو اس مکتب میں خاص اہمیت

ملی۔ امام مالک کے شاگردوں نے "المدونۃ" جیسی کتب کے ذریعے اس مکتب کو منظم کیا۔ یہ مکتب شمالی و مغربی افریقہ، اندلس کی تاریخ اور آج مراکش، الجزائر، لیبیا وغیرہ میں غالب ہے۔

3۔ شافعی مکتب

شافعی مکتب کے امام محمد بن ادریس شافعی (150ھ تا 204ھ) نے حدیث اور رائے کی دونوں روایتوں کو اصولوں کی بنیاد پر جمع کیا۔ انہی کی "الرسالۃ" اصولِ فقہ کی بنیاد ہے اور "کتاب الام" ان کے فقہی اقوال کا بڑا ذخیرہ ہے۔ اس مکتب میں نصوص کی ظاہری دلالت کو مضبوطی سے تھامنا، قیاس کو حدود میں رکھنا اور خبرِ واحد کی حجیت پر زور نمایاں ہے۔ یہ مکتب مصر، شام، عراق کے بعض حصوں، یمن، مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً انڈونیشیا میں پھیلا ہوا ہے۔

4۔ حنبلی مکتب

حنبلی مکتب کے امام احمد بن حنبل (164ھ تا 241ھ) بغداد کے عظیم محدث و فقیہ تھے۔ ان کی "المسند" حدیث کے بڑے ذخائر میں سے ہے اور ان کے مسائل ان کے شاگردوں کی روایات سے جمع ہوئے۔ اس مکتب میں حدیث و آثار کو قیاس پر مقدم رکھنا اور ضرورت کے بغیر رائے سے احتیاط خاص وصف ہے، اگرچہ حنبلی فقہاء نے بھی ضرورت کے مقامات پر قیاس و مصلحت کو استعمال کیا ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسی شخصیات اسی مکتب کے علمی ماحول سے اٹھیں۔ یہ مکتب جزیرۂ عرب خصوصاً سعودی عرب و قطر میں نمایاں ہے اور فقہی وسعت کے اعتبار سے آج اس پر تحقیق کا کام بھی بہت ہو رہا ہے۔

جدول 1: مسالکِ اربعہ — امام، مرکز اور نمایاں بنیادی تالیفات

مکتب	امام (وفات)	بنیادی تالیفات
حنفی	ابو حنیفہ (150ھ)، کوفہ	ظاہر الروایہ (امام محمد)، الہدایہ، رد المحتار
مالکی	مالک بن انس (179ھ)، مدینہ	الموطا، المدونۃ، مختصر خلیل، الشرح الکبیر

الرسالۃ، الام، منہاج الطالبین اور اس کی شروح	محمد بن ادریس شافعی (204ھ)	شافعی
المسند، مسائل امام احمد، المغنی (ابن قدامہ)	احمد بن حنبل (241ھ)، بغداد	حنبلی

بنیادی تالیفات کا مختصر تعارف

حنفی مکتب کی بنیادی تالیفات میں امام محمد کی چھ کتابیں، جنہیں "ظاہر الروایہ" کہا جاتا ہے — الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر، الزیادات اور المبسوط الاصلی — اس مکتب کی اصل بنیاد ہیں۔ مرغینانی کی "الہدایہ" صدیوں سے درس و فتویٰ کا مرکزی متن رہا ہے۔ صغیر میں اس کی شروح و تراجم عام ہیں۔ قدوری کی "مختصر القدوری" ابتدائی متن کے طور پر، اور ابن عابدین شامی کی "رد المحتار" متاخرین کے فتاوے و تحقیق کے سب سے بڑے حوالے کے طور پر مشہور ہے۔ مالکی مکتب میں الموطا کے بعد "المدونۃ الکبریٰ" جسے امام سحنون نے ابن القاسم کی روایات سے مرتب کیا، اس مکتب کی فقہی بنیاد سمجھی جاتی ہے؛ بعد میں خلیل بن اسحاق کا "مختصر خلیل" اور اس پر دردیر کی شرح متداول متون بنے۔ شافعی مکتب میں امام شافعی کی "الام" اور مزنی کی مختصر کے بعد نووی کی "منہاج الطالبین" اور اس پر ابن حجر ہیتمی و رملی کی شروح اس مکتب کے معتمد متون ہیں۔ حنبلی مکتب میں خرقی کی مختصر پر ابن قدامہ کی "المغنی" فقہِ مقارن کی عظیم کتاب ہے جو دلائل کے ساتھ چاروں مکاتب کا جائزہ بھی پیش کرتی ہے، اور یہ کتاب محض حنبلی حلقوں میں نہیں بلکہ ہر مکتب کے محققین کے یہاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ان تالیفات کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر نسل نے پچھلی کتابوں پر شرح، اختصار یا تنقید کر کے علم کو زندہ رکھا؛ اسی تسلسل کو فقہی روایت کی جان کہا جاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ان بنیادی کتابوں کے علاوہ ہر مکتب میں فتاوے کے مجموعے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً حنفیہ میں "الفتاویٰ الہندیہ" جو عالمگیری دور میں علماء کے ایک بورڈ نے مرتب کی، اور "فتاویٰ قاضی خان" وغیرہ۔ فتاوے کی یہ کتابیں بتاتی ہیں کہ فقہ محض نظری علم نہیں تھا بلکہ عدالتوں، بازاروں اور گھریلو زندگی میں نافذ العمل قانون تھا۔ جدید دور میں اسلامی فقہ اکیڈمیوں کے اجتماعی اجتہاد اور ان بنیادی متون کے جدید ایڈیشنوں و تراجم نے اس ورثے کو نئے قارئین تک پہنچایا ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے مکتب کے آسان درسی متن سے آغاز کرے، پھر ہدایہ یا المغنی جیسی کتب کی طرف بڑھے، اور اختلافی مسائل میں تقابل کو تعصب کے بجائے وسعتِ علم کا ذریعہ سمجھے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ علمِ فقہ دلائل سے ثابت شدہ عملی شرعی احکام کا علم ہے اور مسالکِ اربعہ اس کے چار عظیم مدون نظام ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی اصولی بنیادیں اور بنیادی تالیفات ہیں: حنفیہ کے لیے ظاہر الروایہ و الہدایہ مالکیہ کے لیے الموطا و المدونۃ، شافعیہ کے لیے الام و المنہاج اور حنابلہ کے لیے المسند و المغنی اس کی شاہکار مثالیں ہیں۔ ان مکاتب کا باہمی اختلاف فقہی وسعت و رحمت ہے جس نے ہر خطے و دور کے مسلمانوں کو شریعت پر عمل کی منظم صورت فراہم کی۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com